چاک سے اُترے وجود

شہزاد نیّر



بے شک انسان جلد باز ہے

قسمت کی تختی سے میں نے
اک پل آنکھ اُٹھا کر دیکھا
کچرے کے اک ڈھیر پہ بچّے
ادھ کھائی روٹی پر لڑتے
اک دوجے سے
وہ ٹکڑے بھی چھین رہے تھے
جن کو میں نے
ازل سمے کے پہلے پل سے
اُن کے بخت میں لکھ رکھا تھا!!

چاک سے اُترے وجود

شہزاد نیّر

رابطہ مصنف:
A-249، ماڈل ٹاؤن، گوجرانوالہ
0321-8110989 0308-5586719
shahzadnayyar@yahoo.com
shahzadnayyar@hotmail.com
www.shahzadnayyar.com

قانونی مشیر: چوہدری ریاض اختر (ایم اے، ایل ایل بی)

ناشر: فواز نیاز

قیمت: -/200 روپے

آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319

تقسیم کنندہ: سیلز ڈپو لاہور: اردو بازار، فون: 042-7220879
سیلز ڈپو کراچی: اردو بازار۔فون: 021-2765086
سیلز ڈپو راولپنڈی: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک۔فون: 051-5539609
سیلز ڈپو ملتان: اندرون بوہڑ گیٹ۔ فون: 061-4781781
سیلز ڈپو فیصل آباد: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار۔فون: 041-2627568
سیلز ڈپو حیدر آباد: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ۔ فون: 0300-3012131

جہانگیر بکس
www.jbdpress.com
E-mail:info@jbdpress.com

اِنتساب

اُن خوابوں بھری آنکھوں کے نام

جو

محبت میں جینے کی راہ دیکھتی ہیں

اب تو ڈر ہے مجھے کہ غم تیرا
تجھ سے بھی معتبر نہ ہو جائے

ترتیب

نظمیں

رستے

(پیش لفظ)

پھول صحرا کے درمیاں بھی کھلے
اُس پہ تتلی پہنچ ہی جاتی ہے
آنکھ بَن میں رہے کہ گلشن میں
اپنا محبوب ڈھونڈ لاتی ہے

شمع چاہے کسی مزار کی ہو
اُس پہ پروانے مرنے لگتے ہیں
پیڑ ویرانے میں بھی اُگ آئے
اُس پہ پنچھی اُترنے لگتے ہیں

خاک صحرا کی ہو کہ آنگن کی
سر میں سودا اُڑا ہی دیتی ہے
بات دِل سے چلے تو جذبوں تک
اپنا رستہ بنا ہی لیتی ہے

دو چار سوالات ہیں پھر مجھ کو اجازت!
میں سیر کی خاطر تو فلک پر نہیں آیا

غزلیں

یہی کُھلا کہ مسافر نے خود کو پار کیا
تری تلاش کے صحرا کو پار کرتے ہوئے

اِس سمت سمیٹوں تو بکھرتا ہے اُدھر سے
دُکھ دیتے ہوئے یار نے دامن نہیں دیکھا

جب بھی چپکے سے نکلنے کا ارادہ باندھا
مجھ کو حالات نے پہلے سے زیادہ باندھا

چلتے پھرتے اسے بندش کا گماں تک نہ رہے
اُس نے اِنسان کو اس درجہ کشادہ باندھا

کتنی بھی تیز ہوئی حِرص و ہوس کی آندھی
ہم نے اک تارِ توکّل سے لبادہ باندھا

یک بہ یک جلوۂ تازہ نے قدم روک لیے
میں نے جس آن پلٹنے کا ارادہ باندھا

تو نے سامان میں جب باندھ ہی دی تھی منزل
کس لیے یار! مرے پاؤں میں جادہ باندھا

اُس نے دل باندھ کے اک آن میں بازی جیتی
ہم تو سمجھے تھے، فقط ایک پیادہ باندھا

سادگی حسن کی شعروں میں بیاں کرنی تھی
لفظ آسان چُنے، مصرعۂ سادہ باندھا

◎

مہ و نجوم کا ملبہ بدن پہ آن گرا
کوئی طناب کٹی تھی کہ آسمان گرا

ہزار ہاتھ فضا میں علم بنائیں گے
مرے غنیم! سنبھل کر مرا نشان گرا

جنون و عقل کی کیسی عجب لڑائی تھی
نظر بچا کے میں دونوں کے درمیان گرا

فلک نشین تو زوروں سے کھینچتا تھا مُجھے
میں خود ہی گرتا گراتا زمیں پہ آن گِرا

سروں پہ دھوپ اُٹھائے یہاں تک آئے تھے
قدم جمے بھی نہیں تھے کہ سائبان گِرا

تمھارے ہجر کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہی
مِرے بدن کا لرزتا ہوا مکان گِرا

اُدھر دُعا کو اُٹھائے ہوئے وہ ہاتھ گرے
اِدھر وجود کی کشتی کا بادبان گِرا

موجۂ سیلابِ غم، عزم جوانی لے گیا
آنکھ میں جو خواب تھے نمکین پانی لے گیا

خود فراموشی کا ریلا پہلے بھی آیا مگر
اب کے جو آیا تو سب یادیں پرانی لے گیا

تیرے میرے درمیاں جو مدّتوں حائل رہی
ایک ہی آنسو، بہا کر، بدگمانی لے گیا

صُورتِ ہمدرد جو آیا، کہانی کار تھا
چند آنسو دے کے وہ میری کہانی لے گیا

میری چوکھٹ پر سمندر آ گیا تھا ایک دِن
میرے دل سے مانگ کر وہ بے کرانی لے گیا

کیسے ہُوا میں پار، کہاں جانتے ہو تُم
اے ساحلوں کے یار، کہاں جانتے ہو تم

آتا ہے کون آنکھ میں آنسو کے روپ میں
اے میرے راز دار، کہاں جانتے ہو تم

ہستی کے آسمان سے تو ڈوبتا ہوں میں
اب ہُوں گا آشکار کہاں، جانتے ہو تم

تُم لذّتِ وصال ہی میں خرچ ہو گئے
وہ لطفِ انتظار، کہاں جانتے ہو تم

کربِ شکستِ ذات سے دل ٹوٹتا ہے کیا
تم حسنِ پائدار، کہاں جانتے ہو تم

ہر شام بحرِ ہوش کی لہروں سے کھیلتے
جاگتے ہیں بادہ خوار کہاں، جانتے ہو تم؟

نیرّ سُنو، تم اک تو خسارہ نصیب ہو
پھر دِل کے کاروبار کہاں جانتے ہو تم

◎

سوچوں کو منجدھار کِیا، خود کو پتوار کِیا
دِل کا دریا پار کِیا اور پہلی بار کِیا

ہجر کی پہلی شام پڑے دو بھاری کام پڑے
اُس کو بھی تیّار کِیا، دِل بھی تیّار کِیا

قطرہ قطرہ جھیل بنیں پھر آنکھیں نیل بنیں
مُجھ کو بہتی دھار کِیا، ساون کی تار کِیا

دل کی سپتک آگ ہوئی، جاں دیپک راگ ہوئی
شعلوں سا اظہار کِیا، لہجہ انگار کِیا

دُشمن کی پہچان کہاں پھر اِس کا دھیان کہاں
اندھوں کو سالار کِیا، بے دیکھے وار کِیا

جانے کیسے دیس گئے، تُم کیوں پردیس گئے
کیا میرے دلدار کِیا، ساون بے کار کِیا

دھیرے دھیرے رات چلی، دُکھ کی بارات چلی
آہوں کو جھنکار کیا، دل بجتا تار کِیا

ہمراہی سب جانتے ہیں دُکھ موسم، سُکھ موسم
سب پر یکساں بار کیا، رستا ہموار کِیا

دل کے بدلے دل مانگا اور پیار کے بدلے پیار
تُم سمجھے ہو پیار کیا، یہ تو بیوپار کِیا

نیّرؔ جگ کی باتوں سے، خود اپنے ہاتھوں سے
ہر رستا دیوار کیا، جینا دشوار کِیا

ہر ایک گام پہ صدیاں نثار کرتے ہوئے
میں چل رہا تھا زمانے شمار کرتے ہوئے

یہی کھلا کہ مسافر نے خود کو پار کیا
تری تلاش کے صحرا کو پار کرتے ہوئے

میں رشکِ ریشہ گُل تھا، بدل کے سنگ ہوا
بدن کو تیرے بدن کا حِصار کرتے ہوئے

مُجھے ضرور کنارے پکارتے ہوں گے
مگر میں سُن نہیں پایا، پکار کرتے ہوئے

میں اضطرابِ زمانہ سے بچ نکلتا ہوں
تُمھارے قول کو دل کا قرار کرتے ہوئے

جہانِ خواب کی منزل کبھی نہیں آئی
زمانے چلتے رہے، انتظار کرتے ہوئے

میں راہِ سودوزیاں سے گزرتا جاتا ہوں
کبھی گریز کبھی اختیار کرتے ہوئے

نہیں گرا مری قاتل اَنا کا تاج محل
میں مر گیا ہوں خود اپنے پہ وار کرتے ہوئے

میں اور نیم دلی سے وفا کی راہ چلوں!
میں اپنی جاں سے گزرتا ہوں پیار کرتے ہوئے

یقین چھوڑ کے نیّرؔ گماں پکڑتا رہا
نگاہِ یار! ترا اعتبار کرتے ہوئے

شکستہ چھت میں پرندوں کو جب ٹھکانہ ملا
میں خوش ہوا کہ مرے گھر کو بھی گھرانہ ملا

فلک پہ اُڑتے ہوئے بھی نظر زمیں پہ رہی
مزاج مجھ کو مقدّر سے طائرانہ ملا

ہم اُن کے حسنِ سخن کی دلیل کیا دیں گے
وہ جتنی بار ملا ہم سے، برملا نہ ملا

کسی کی دیکھتی آنکھیں بھی آس پاس رہیں
تجھے مِلا تو بہ احساسِ مجرمانہ مِلا

میں اپنی بات درختوں سے کہہ کے روتا ہوں
کہ میرے غم کو کسی رُت نہ آشیانہ ملا

اب آگیا ہے تو چپ چاپ خامشی کو سُن
مرے سکوت میں اپنی کوئی صدا نہ ملا!

لڑی سی ٹوٹ کے آنکھوں سے گِر پڑی نیّر
لبوں سے حرف کا کوئی بھی سلسلہ نہ ملا

جبیں پہ رکھّے، بصد شان لے کے چلتے ہیں
عجیب لوگ ہیں، بہتان لے کے چلتے ہیں

متاعِ عشق جہاں والے کب کے چھوڑ گئے
ہم اہلِ درد یہ سامان لے کے چلتے ہیں

ہمیں تُم عدل کا مفہوم کیا بتاؤ گے
ہم اپنے دوش پہ میزان لے کے چلتے ہیں

یہ میرے لوگ، یہ سہمے، ستائے، ہارے لوگ
گھروں سے جان کا تاوان لے کے چلتے ہیں

ہم اپنی آنکھ میں سمٹے ہوئے تماشائی
لبوں کی اوٹ میں طوفان لے کے چلتے ہیں

جسے بلاؤ وہ بارود بن کے پھٹتا ہے
یہ لوگ کون سا ہیجان لے کے چلتے ہیں

تو بنا کے پھر سے بگاڑ دے، مجھے چاک سے نہ اُتارنا
رہوں کوزہ گر ترے سامنے، مجھے چاک سے نہ اُتارنا

تری ''چوبِ چاک'' کی گردشیں مرے آب و گِل میں اُتر گئیں
مرے پاؤں ڈوری سے کاٹ کے مجھے چاک سے نہ اُتارنا

تری اُنگلیاں مرے جسم میں یونہی لمس بن کے گڑی رہیں
کفِ کوزہ گر مری مان لے مجھے چاک سے نہ اُتارنا

مجھے رُکتا دیکھ کے کرب میں کہیں وہ بھی رقص نہ چھوڑ دے
کسی گردباد کے سامنے، مجھے چاک سے نہ اُتارنا

ترا زعمِ فن بھی عزیز ہے، بڑے شوق سے تُو سنوار لے
مرے پیچ و خم، مرے زاویے، مجھے چاک سے نہ اُتارنا

ترے ''سنگِ چاک'' پہ نرم ہے مری خاکِ نم، اِسے چھوتا رہ
کسی ایک شکل میں ڈھال کے مجھے چاک سے نہ اُتارنا

مجھے گوندھنے میں جو گُم ہوئے ترے ہاتھ، اِن کا بدل کہاں
کبھی دستِ غیر کے واسطے مجھے چاک سے نہ اتارنا

ترا گیلا ہاتھ جو ہٹ گیا مرے بھیگے بھیگے وجود سے
مجھے ڈھانپ لینا ہے آگ نے، مجھے چاک سے نہ اتارنا

کہاں ہے وحشتِ نم ناک میری
بہت اُڑنے لگی ہے خاک میری

نہ اتنا ذکر ہو باغِ عدن کا
وہیں چھینی گئی پوشاک میری

زمیں نے کھینچ کر دل سے لگایا
اُڑائی آسماں نے خاک میری

بدن کی شاخ سے میں اُڑ چکا تھا
کہاں رکھتا رہا وہ تاک میری

میں چپ رہتا تو بچ سکتی تھی گردن
مگر یہ فطرتِ بے باک میری!

مرے شانوں پہ چادر تک نہ ڈالی
زمیں اوڑھے رہے، افلاک، میری

مجھے ہی بھوک میں کھانے کو دوڑے
تمنا اس قدر سفّاک میری!

عدو سہمے کھڑے ہیں، میں نہیں ہوں
عجب بیٹھی ہوئی ہے دھاک میری

انا پر وار کو گردن پہ روکا
رہی ہے مجھ سے آگے ناک میری

مرے پہلے گنہ کے بعد نیّرؔ
بہت روئی سرشتِ پاک میری

تم گئے تو جہان بھی نہ رہا
دل کو دنیا کا دھیان بھی نہ رہا

کیا زمانہ تھا، ہم بھی ہوتے تھے
اب ہمارا گمان بھی نہ رہا

خاک پر میرے ساتھ آ بیٹھے!
کیا تمھارا مکان بھی نہ رہا؟

سرحدِ جسم سے نکلتے ہی
کیا زمیں، آسمان بھی نہ رہا

اس طرح مٹ گیا ہوں دنیا سے
دیکھنے کو نشان بھی نہ رہا

اچھے لفظوں میں اُس کو یاد کرو
اب تو وہ درمیان بھی نہ رہا

آخری سانس تک تھا ساتھ مرے
اور پھر امتحان بھی نہ رہا

تم محبت تلاش کرتے ہو!
اُس کا تو خاندان بھی نہ رہا

اس سے کچھ مانگنا نہیں تیّرؔ
کیا کرو گے جو مان بھی نہ رہا

کیسے چلوں کہ رحمتِ یزداں نہیں رہی
ماں کی دُعا بھی شاملِ ساماں نہیں رہی

میں کوچۂ جمال سے واپس نہ آسکا
دل رہ گیا کہیں تو کہیں جاں نہیں رہی

ہم کیا کریں کہ خواہشِ تعمیر کھو گئی
ہم کیا کہیں کہ جراتِ رنداں نہیں رہی

شوریدہ سر بھی شہر میں ویسے نہیں رہے
جیسی رہی ہے رونقِ زنداں، نہیں رہی

یہ کھوکھلا خطاب کسی کام کا نہیں
خلقت ہمارے شہر کی ناداں نہیں رہی

من مانیاں اُتار لے لیکن خیال رکھ
دھرتی پہ اب وہ حالتِ ایماں نہیں رہی

دل سے نشاطِ درد کے ساماں اٹھا دیئے گئے
آنکھیں لپیٹ دی گئیں، ساغر بڑھا دیئے گئے

دل میں ملال آگیا، لب پر سوال آگیا
شیشے میں بال آگیا، رشتے بھلا دیئے گئے

بُغضِ دروں کا سلسلہ، گزرے ہوؤں سے جا ملا
قبریں اکھیڑ دی گئیں، کتبے ہٹا دیئے گئے

اس شہرِ بے اصول میں اک جنبشِ نگاہ پر
رتبے بڑھا دیئے گئے، رُتبے گھٹا دیئے گئے

پیکارِ غم نصیب میں، پیکانِ نم، نقیب تھے
گفتارِ سم نصیب میں خنجر بجھا دیئے گئے

راہیں نظر سے دور تھیں، آنکھیں تھکن سے چور تھیں
اس کی گلی تک آئے تو، تارے بجھا دیئے گئے

غارت گرانِ شہر سے جب اور کچھ نہ بن سکا
معبد وفورِ خون سے مقتل بنا دیئے گئے

اس فکروفن کے کھیل میں کردارِ مرکزی تھا میں
منظر پہ آ نہیں سکا، پردے گرا دیئے گئے

ہاتھوں کی اوٹ اُٹھ گئی، جیون کی جوت لُٹ گئی
گرتے ہی آنکھ بجھ گئی، آئی ہوا، دیئے گئے

میانِ سیلِ رقیباں، مرا نشان کھلا
ہوا خلاف سے آئی تو بادبان کھلا

اے میرے سانس پرندے! سفر طویل نہ رکھ
تو ایک عمر کی بندش پہ ایک آن کھلا

میں اُس طرف کا فسانہ کہوں تو کیسے کہوں
زبان بند ہوئی تھی تو آسمان کھلا

بدن میں نرم حرارت کی باس گھلنے لگی
برنگِ مہرِ زِمستاں، وہ مہربان کھلا

مرے سخن کا سلیقہ بچا گیا مجھ کو
میں آگیا تو عدو پر مرا بیان کھلا

میں اب وہ بات بتاؤں کہ سوئے دار چلوں
یہ میرا بندِ سخن بھی کہاں پہ آن کھلا

چلی چلی مری جانب سلگتی دھوپ چلی
کھلا کھلا تری زلفوں کا سائبان کھلا

مری صدا میں ملاتا نہیں صدا کوئی
میں کیسے بند زبانوں کے درمیان کھلا

پلٹ ہی پاؤں نہ آگے ہی جا سکوں نیّرؔ
عجیب موڑ پہ آ کر وہ کم زبان کھلا

کوئی رُت بھی نہیں دنیا میں سہانی دل سے
کتنی بے کیف رہی نقلِ مکانی دل سے

تم نے جو درد کا بادل سا اُڈتے دیکھا
یہ تو نکلی ہے مری رنج بیانی دل سے

کتنے چہرے ہیں نئے، آنکھ میں آتے جاتے
ہائے جاتی ہی نہیں شکل پرانی دل سے

کیا خبر ہم بھی زمانے کو بہا لے جاتے
پھوٹ نکلی ہی نہیں کوئی روانی دل سے

سب مروّت میں مری بات سنے جاتے ہیں
مانتا کوئی نہیں میری کہانی دل سے

اب جدا کرنے سے دونوں نہیں بچتے نیّرؔ
سخت لپٹی ہے کوئی یاد پرانی یاد سے

کل تلک ہوتا رہا، آج نہیں ہونے کا
اب زمانے پہ ترا راج نہیں ہونے کا

استقامت سے نکالوں گا میں قامت اپنا
میں کبھی تاج کا محتاج نہیں ہونے کا

رات دن ایک کیے جاتے ہیں کارِ دل میں
صرف باتوں سے تو یہ کاج نہیں ہونے کا

کیسے ٹھہرے گا یہاں پیار کہ تو نے دل کو
اس طرح چھلنی کیا، چھاج نہیں ہونے کا

دل کو اس درجہ خوش آئی ہے حکومت غم کی
کچھ بھی ہو جائے، یہ بے تاج نہیں ہونے کا

میں نے کچھ خوف لرزتے ہوئے گھر میں رکّھا
اور کچھ چلتے ہوئے زادِ سفر میں رکّھا

اُس کے پیمان کو بھی دل میں جگہ دی لیکن
حوصلہ اُس سے بچھڑنے کا جگر میں رکّھا

مطلعِ چشم پہ چھائے رہے غم کے بادل
پھر بھی اس چاند کو تاعمر نظر میں رکّھا

میں نے سنگین فصیلیں تو اُٹھائیں لیکن
ایک در تیرے لیے دل کے نگر میں رکّھا

اس طرح رنگ ترے آنکھ سے ڈھلتے دیکھے
پھر کوئی عکس نہیں دیدۂ تر میں رکّھا

جان گرتے ہوئے طائر کے بدن سے نکلی
رہ گیا عزمِ سفر جھولتے پر میں رکّھا

ساری خیراتِ خرد ہم نے لٹا دی نیّر
ایک سودائے جنوں کاسۂ سر میں رکّھا

سو اب کیا رہ گیا لکھنا ہمارا
کوئی لکھ بھی چکا مٹنا ہمارا

کسی کی آنکھ بھی ہم تک نہ آئی
بھلایا جا چکا آنا ہمارا؟

وہ جس کی سانس پر جیتے رہے ہیں
اُسی کے ہاتھ ہے مرنا ہمارا

کوئی ملتا نہیں ہے جس سے پوچھیں
کہاں گم ہو گیا، ہونا ہمارا

نئی آنکھوں میں گھر کرنے نہ دے گا
پرانے خواب میں رہنا ہمارا

سرِ بزمِ جہاں سب ہنس رہے ہیں
تماشا ہو گیا رونا ہمارا

ہمیں بے مول کرتا جا رہا ہے
دھڑا دھڑ، در بدر بکنا ہمارا

زمانہ ریت کا طوفاں ہے، جاگو
اجل بن جائے گا سونا ہمارا

فلک سے رفتگاں نے جھک کے دیکھا
بساطِ خاک سے اُٹھنا ہمارا

بے سبب پیار میں کمی پہ نہ آ
اے مرے دوست، دُشمنی پہ نہ آ

رہ روِ عشق! کچھ ڈگر کا خیال
اتنی دور آ کے کج روی پہ نہ آ

ہم نشیں! حرمتِ سخن تک رہ
اس میں امکانِ بے زری پہ نہ آ

چشمِ مغرورِ اختیار! پلٹ
دیکھ یوں میری بے بسی پہ نہ آ

دلبرِ شوخ! دلبری پہ رُک
آتے آتے تو دل لگی پہ نہ آ

کیا خبر کل کدھر چلا جائے
دل، مری مان، اجنبی پہ نہ آ

دلبرا! دل میں کچھ قیام ذرا
مُطربا! سازِ رخصتی پہ نہ آ

جانِ آشفتۂ طوالتِ ہجر
بے قراری سے بے دلی پہ نہ آ

حرف رکھنا ہے تو مجھی پر رکھ
نکتہ چیں! میری شاعری پہ نہ آ

⊚

لہو کی موج سفینوں کے سنگ لے آئے
بنامِ امن وہ ساحل پہ جنگ لے آئے

جنہیں کتاب، دلائل، فنون بھیجے تھے
ہمارے واسطے تیر و تفنگ لے آئے

جب آنے والا ہی دشنہ بدست آیا ہو
تو کوئی کیسے مقابل میں چنگ لے آئے

اسے ترقی و تہذیب کس طرح مانوں
جو اپنے ساتھ سپاہ و خدنگ لے آئے

لباسِ آہنِ برتر وہ لے کے آیا تھا
فنائے جسم کی گدڑی ملنگ لے آئے

فسانہ صاف حقیقت دکھائی دینے لگا
وہ گفتگو میں انوکھا ہی ڈھنگ لے آئے

مجھے تو روح کی مستی میں مست ہونا تھا
مگر وہ لوگ بدن کی ترنگ لے آئے

کوئی بھی سمت ہو، کومل سُروں میں بات کرے
ہماری سمت وہ تیور کا انگ لے آئے

ابھی گلاب تو باقی ہیں میرے دامن میں
مرے عدو سے کہو، اور سنگ لے آئے

اُفق پہ خون کے بدلے دھنک دکھائی دے
خدا کرے کہ مری بات رنگ لے آئے

یوں تو یہ شہر تھا زنجیر بپا پہلے سے
اب کے لیکن یہ اسیری ہے جدا پہلے سے

مدتوں بعد تجھے دیکھنے نکلی آنکھیں
تو کہیں میرے خیالات میں تھا پہلے سے

تم سے آگے ہوں محبت میں تو حیران نہ ہو
دیکھ رکھی تھی رہِ دشتِ وفا پہلے سے

اس نے بھی برف کا ملبوس کیا اور دبیز
ہم نے بھی آنچ بڑھائی ہے ذرا پہلے سے

شعلہ رفتار بگولوں سے میں کیا بات کروں
اب کہاں لوگ وہ مانندِ صبا، پہلے سے

درد کے باب میں کچھ اس سے زیادہ نہ ہوا
تیرے آنے سے ذرا اور بڑھا پہلے سے

ہم کو بھی ترکِ شناسائی کا اندازہ تھا
تم نے جو آج کہا، ہم نے کِیا پہلے سے

بے سبب شاخِ شجر سے نہیں اُترے پنچھی
تو بھی اندازۂ افتاد لگا، پہلے سے

تخلیہ توڑ کے دیکھیں تو دکھائی دیں گے
اب وہ حالات نہیں ظلِّ خدا! پہلے سے

اب جو اُجڑا ہے تو کچھ تم پہ تو الزام نہیں
قریۂ دل تھا مرا وقفِ بلا پہلے سے

وہ تو پہلے کے زمانے تھے کہ خوش فہم تھے ہم
اب تو کر لیتے ہیں سامانِ بُکا پہلے سے

تلخیٔ دہر کے اے دوست! بہانے نہ بنا
تیرے انداز تھے مائل بہ جفا، پہلے سے

کچھ تو اس بار تنک ظرف تھے ہم بھی نیّرؔ
اور کچھ اس نے ستایا تھا سوا پہلے سے

ملتا نہیں ہے گوہرِ نام و نشانِ خاک
مقدور بھر تو چھان چکا ہوں جہانِ خاک

پھر مجھ کو دشت دشت پھراتی رہی ہوا
ایسا ہوا میں شاملِ وابستگانِ خاک

سب خاک ہے تو خاک کا ہونا فضول تھا
پھر خاک داں میں کس لیے کھولی دکانِ خاک

اُٹھ جائیں تو فلک کو اُٹھا کر پرے کریں
تیری نظر میں خاک ہیں اُفتادگانِ خاک!

ہم کو نہ آسمانِ تہِ خاک سے ڈرا
ہم لوگ تو ابھی سے ہیں آسودگانِ خاک

ہم سے ہر ایک آن ہے اس کا مکالمہ
ہم خاک زادگاں سے سنو داستانِ خاک

یہ کائنات خواب ہے کہ وہ جہاں خیال
کچھ تو مجھے جواب دو اے خفتگانِ خاک

ہم پر نہیں تو کس پہ کھلیں گے زمیں کے بھید
خاکی سے بڑھ کے کون ہوا رازدانِ خاک

ق

نقشِ قدم حضور ﷺ کے یاں بھی وہاں بھی ہیں
اک خاکِ آسمان ہے اک آسمانِ خاک

لپٹا ہوا ہے آستاں سے جھلملیں غبار
اک نور نے لپیٹ دیا ارمغانِ خاک

نیرؔ نوائے حرف تو مٹی کی چیخ تھی
پندارِ فن کی بات ہے گویا گمانِ خاک

موجۂ درد کو اتنا تو اچھالا جائے
جس طرف ابر چلے، میرا حوالہ جائے

دل کے صحرا میں تہی چشم کھڑا سوچتا ہوں
کس طرح اتنی تمناؤں کو پالا جائے

میرا تو سات زمانوں میں کہیں ذکر نہیں
کن زمینوں میں مجھے ڈھونڈنے والا جائے

تو جو آئے تو اسے مل کے سمیٹیں دونوں
مجھ اکیلے سے کہاں ہجر سنبھالا جائے

بعد میں میرے تہی ذہن پہ ہو طعنہ زنی
پہلے اجداد کے ورثے کو سنبھالا جائے

خالقِ چشم پہ لازم تھا دکھائی دینا!
کیوں نہ پھر اس کو کسی شکل میں ڈھالا جائے

اس کی تعبیر میں لے آؤں گا مہر و مہ سے
کچھ قرینے سے تو یہ خواب اُجالا جائے

یہ نہ ہو آتشِ انکار کے شعلے نکلیں
میری تشکیک کو دوزخ میں نہ ڈالا جائے

آئنہ ظلِّ الٰہی کو دکھایا اِس نے!
ایسے گستاخ کو دنیا سے نکالا جائے

اک تارِ آبِ درد سے کیوں جوڑ ہل گیا
میں تو کڑی چٹان تھا، مٹی میں کیسے مل گیا

بخیہ گری کے شوق میں مجھ سے بڑی خطا ہوئی
چاکِ جنوں کے ساتھ ہی چاکِ خرد بھی سل گیا

کیسے کروں میں روبرو، دونوں بہم ملے نہیں
ہوتا رہا یہ حادثہ، وہ آگیا تو دل گیا

اُس کی طرف کا راستہ آسان سا نشیب تھا
لیکن میں اپنی سمت کو ہر گام مُضمحل گیا

اُترا غبارِ شوق تو دیکھا، حساب اس قدر
اک شخص کو گنوا دیا، اک شخص مجھ کو مل گیا

دائم رہے یہ دھیان میں، خواہش کے گلستان میں
غنچہ طلب کا کِھل گیا، پندارِ آب و گِل گیا

شب کے کھنچے حصار میں، بیٹھا تھا انتظار میں
آہٹ ہوئی تو دور تک پہلو سے اُٹھ کے دل گیا

نیرؔ سخن کے نرخ سے مجھ کو خسارہ کچھ نہیں
دنیا تو مجھ سے کھو گئی، لیکن میں خود کو مل گیا

جسے خود سے ہی نہیں فرصتیں، جسے دھیان اپنے جمال کا
اُسے کیا خبر مرے شوق کی، اُسے کیا پتہ مرے حال کا

مرے کوچہ گرد نے لوٹ کر مرے دل پہ اشک گرا دیا
اسے ایک پل نے مٹا دیا جو حساب تھا مہ و سال کا

تجھے شوقِ دیدِ غروب ہے، مری آنکھ دیکھ بھری ہوئی
کہیں تیرے ہجر کی تیرگی، کہیں رنگ میرے ملال کا

شبِ انتظار وہ مہ لقا، جونہی میرے سامنے آگیا
مجھے کوئی ہوش نہیں رہا، نہ جواب کا نہ سوال کا

کبھی حالِ ہجر کہا نہیں، وہ ملا تو لفظ ملا نہیں
کہیں گفتگو ہی میں کھو گیا، جو معاملہ تھا وصال کا

جسے وقت جانِ غزل کہے، جو چلے تو شام کھڑی رہے
وہی میرے لفظ کا رنگ ہے، وہی روپ میرے خیال کا

◎

ابرِ بے فیض کے ہجراں میں نہ پیلی ہوتی
میری مٹی مرے اشکوں سے جو گیلی ہوتی

جا بجا دیکھنے پڑتے ہیں اُدھڑتے منظر
کاش اندر کو کھلی آنکھ بھی سی لی ہوتی

دیکھتا جاتا تھا حیرت سے میں اُس کی آواز
دم بہ دم دل میں بھرے زہر سے نیلی ہوتی

دل کے میں تارِ شکستہ کو بھی چھیڑے جاتا
زندگی! جو تری آواز سُریلی ہوتی

اب حقیقت کے سرابوں میں گھِرا سوچتا ہوں
زندگی تیرے تصور ہی میں جی لی ہوتی

لذّتِ درد کہاں! لذّتِ دیدار کہاں!
نگہِ یار! تُو جتنی بھی رسیلی ہوتی

چشم در چشم بھٹکتے ہی پھرو گے نیّرؔ
ایک ہی بار خُمِ ذات سے پی لی ہوتی

◎

پاسِ دامِ روایت نہیں کر سکا
اُڑ گیا میں، اطاعت نہیں کر سکا

آنے والوں کے رستے پہ آنکھیں رہیں
جانے والوں کو رخصت نہیں کر سکا

وقت کو بھی خبر ہے کہ صدیوں سے وہ
زندگی کو محبت نہیں کر سکا

میرے اندر کوئی نور زادہ تھا جو
مُولدِ شب کی بیعت نہیں کر سکا

لمبے رستے سے میں کوہِ غم پر چڑھا
مُختصر یہ مسافت نہیں کر سکا

لفظ پر مصلحت کی ردا ڈال کر
کند حرفِ شکایت نہیں کر سکا

تو نے بھی چپ کی ڈوری سے لب سی لیے
میں بھی شورِ بغاوت نہیں کر سکا

سخت وحدت شعار ہوتے ہیں
یہ جو دل کے دیار ہوتے ہیں

کیا غضب ہے کہ ہجر کے دن بھی
زندگی میں شمار ہوتے ہیں

کتنے مہلک ہیں وار آنکھوں کے!
لوگ پھر بھی شکار ہوتے ہیں

آدھے رستے میں بیٹھنے والے
قافلوں کا غبار ہوتے ہیں

کیا کہوں خلوتِ تمنا کی!
یار بھی دل پہ بار ہوتے ہیں

لوٹ آتے ہیں چھوڑنے والے
بخت جب سازگار ہوتے ہیں

دل کی دنیا کو بھی سڑک سمجھو
حادثے بے شمار ہوتے ہیں

اس نے دل کھینچ کر کہا، آؤ!
درد کے آرپار ہوتے ہیں

◎

شکستہ تو تھی ایک دیوار گھر کی
مگر میرے دشمن کو کس نے خبر کی

ابھی چاند رستے میں اپنے پڑا ہے
ابھی ابتدا ہے ہمارے سفر کی

ضرورت نے آنگن میں کمرے اُگائے
بھلا کون سنتا دہائی شجر کی!

نجانے ہوائیں کہاں لے اُڑیں گی
جو چادر ذرا دیر کو سَر سے سَرکی

بہت دیر گزری کہ گزرا نہیں ہوں
خبر کیا سناؤں تجھے دل نگر کی

جو دل میں تھی، گلیوں میں چلنے لگی ہے
یہ کس نے کہانی اِدھر سے اُدھر کی

اندھیرے بڑھے جب ستارے نگلنے
نہ پوچھو کہ نیّرؔ نے کیسے سحر کی

سماں بدلنے کی کچھ تو اساس رہنے دے
چمن میں سرخ بہاروں کی آس رہنے دے

بجا کہ دہر میں سامانِ انقلاب نہیں
متاعِ خوئے بغاوت تو پاس رہنے دے

اِسی سے نسلِ رواں کا شعور مہکے گا
ہوا میں فکرِ تغیر کی باس رہنے دے

ابھی سے اپنے ارادوں کو آشکار نہ کر
ابھی نگاہ میں حسنِ قیاس رہنے دے

دکھا نہ اے دلِ سادہ تو سبز باغ مجھے
ستم شعار کو وعدے کا پاس؟ رہنے دے!

نگاہ پھیر کے مجھ کو برہنہ جسم نہ کر
مرے بدن پہ نظر کا لباس رہنے دے

میں تیرے وصل کی لذّت کا معترف ہوں مگر
تو اپنے ہجر میں مجھ کو اداس رہنے دے

خدائے ارض! میں بیٹی کے خواب کات سکوں
تو میرے کھیت میں اتنی کپاس رہنے دے

پلا دے بادۂ دیدار جن کو خواہش ہے
مجھے تو پیاس عطا کر، گلاس رہنے دے

جو بات دل میں ہے نیّرؔ وہ بے دھڑک کہہ دے
ذرا سی لہجے میں لیکن مٹھاس رہنے دے

کربِ تعبیر تو آنکھوں میں ٹھہر جائے گا
ریزہ ریزہ مرے خوابوں کا بکھر جائے گا

دل تو میرا ہے مگر اِس پہ تسلّط اُس کا
لاکھ کھینچوں میں اِدھر کو، یہ اُدھر جائے گا

جس کی ٹھنڈک میں رہا ڈوب کے سورج دن بھر
شام کو آگ اُسی جھیل میں بھر جائے گا

میری قسمت میں یہ چکّر تو ہمیشہ سے رہا
جس طرف ناؤ مری ہوگی، بھنور جائے گا

دل کی دیوار پہ لمحوں کی نشانی ہو گی
وقت دریا تو بہرحال گزر جائے گا

میں نے اِس آس پہ سورج کو نکالا گھر سے
چاند آنگن میں کسی روز ٹھہر جائے گا

غم کی یلغار کو چہرے پہ عیاں ہونے دے
درد سے حسن ترا اور نکھر جائے گا

بھاگ رہے ہیں لے کر جلتا سایا تُو اور میں
دھوپ سے لڑنے کیوں نکلے تھے تنہا تُو اور میں

اپنی اپنی سوچ کی اُلفت ڈھونڈ رہے تھے ہم
اس خواہش میں کھو بیٹھے ہیں رستہ تُو اور میں

سنّاٹے کی چیخیں گونجیں کب تک کانوں میں
آوازوں کی اور چلیں اب آ جا تُو اور میں

آخر شب میں چلتے چلتے تھک جاتے ہیں سب
چندا، بادل، دھرتی، خوشبو، دریا، تو اور میں

دیکھنا ساجن چھلک نہ جائے پانی آنکھوں سے
تینوں ایک ہی پیاس میں روئیں صحرا تو اور میں

جانے کس پل روتے روتے نیند نگر میں کھوئے
ایک غزل بھی کات نہ پائے چرخہ تو اور میں

اب کی بار برابر ہو کر جاتے ہیں دونوں
اگلے ساون پھر آئیں گے برکھا! تو اور میں

اب کوئی نیند کی سولی سے اُتارے تم کو
مار ڈالیں نہ کہیں خواب تمہارے تم کو

جس سہولت سے ہمیں ہار دیا ہے تم نے
اُس سہولت سے کبھی کوئی نہ ہارے تم کو

ایک جگنو کو ہتھیلی سے اُڑانے والے
مل نہ پائیں گے کبھی چاند ستارے تم کو

ہائے چھوڑا ہی نہیں عرشِ تغافل تم نے
کوئی کتنا ہی زمینوں سے پکارے تم کو

میں بھی دیکھوں گا کنارے سے طلب کی کشتی
کون دیتا ہے تلاطم میں سہارے تم کو

یاد کر لینا فقیروں کی شکستہ پائی
دشتِ ہجراں اگر اپنے سے گزارے تم کو

رنجِ دنیا جو بگاڑے تو دعا ہے میری
دونوں ہاتھوں سے غمِ عشق سنوارے تم کو

جاؤ تم چین کی بستی کو مگر یاد رہے
بھول جائیں نہ کہیں درد کے مارے تم کو

فرشِ زنداں کے مکینوں نے تمہیں جانا ہے
جان پائے نہ کبھی بُرج، منارے تم کو

اب تو آنکھوں میں ہی سب توڑ رہے ہو نیّرؔ
یاد آئیں گے یہی خواب ہمارے تم کو

دکھ درد کو آنکھوں سے گزرنے نہیں دیتا
سیلاب تو دیتا ہے وہ، جھرنے نہیں دیتا

رہتا تو ہے آنکھوں میں وہ آئینہ برابر
جب مجھ کو سنورنا ہو، سنورنے نہیں دیتا

میں اُس کے دلِ سخت میں گھر کیسے کروں گا
جو اپنے گلی سے بھی گزرنے نہیں دیتا

خود ٹوٹ کے بکھروں تو بکھر جاؤں بلا سے
میں درد کی دولت تو بکھرنے نہیں دیتا

دل اب بھی لپکتا ہے سرِ ساحلِ خواہش
وہ چاند سمندر کو اترنے نہیں دیتا

میں مائلِ انکار تو ہو جاتا ہوں، دنیا!
دل مجھ کو محبت سے مکرنے نہیں دیتا

پھر مجھ کو اٹھا دیتا ہے دامن کی ہوا سے
مرنے کا ارادہ ہو تو مرنے نہیں دیتا

پیمانۂ لبریز تو ہجراں کی عطا ہے
آ جائے تو وہ آنکھ بھی بھرنے نہیں دیتا

ہونٹوں کی تمنا تو بڑی بات ہے نیرؔ
آنکھوں کی تمنا بھی وہ کرنے نہیں دیتا

تلاش بول رہی ہے نہیں ملا اب تک
جہاں پکار رہا ہے خدا خدا اب تک

ہر ایک درد کو عادت بنا لیا دل نے
بس ایک ہجر کا عادی نہیں ہوا اب تک

زمیں کے ساتھ لپٹنے کا آگیا ہے خیال
تو کون دیس میں رہتی رہی ہوا، اب تک

سکوت چار طرف ہے مگر سکون کہاں
دلوں میں کھول رہی ہے مری صدا اب تک

کھلا یہ آج کہ اس کا سرا نہیں کوئی
میں جس خیال گرہ سے بندھا رہا اب تک

مِرا خیال ہے، اک بھی نہیں بچا ورنہ
کوئی تو آن کے مقتل میں بولتا اب تک

یہ پوچھتی ہے بشر سے فلک کی خاموشی
تو کس کے نام پہ سہتا رہا سزا اب تک

ہر ایک دور نے اپنے لیے تجھے سوچا
کوئی تو تیرے لیے تجھ کو سوچتا اب تک

مرا نہیں تو وہ پھر کِس کا خواب ہے نیّرؔ
جو میری آنکھ کو دیتا رہا صدا اب تک

یوں نہ رستوں میں بٹ گیا ہوتا
میں جو واپس پلٹ گیا ہوتا

چہرہ چہرہ نہ یوں بکھر جاتا
میرے دل میں سمٹ گیا ہوتا

میں نے گر کر زمیں کو تھام لیا
ورنہ ساغر الٹ گیا ہوتا

وہ تو دل تھا وگرنہ یہ آنسو!
سنگ ہوتا تو کٹ گیا ہوتا

جا رہا تھا تو اس کے دامن سے
میں ہی جا کر لپٹ گیا ہوتا

ان سے قامت تو خیر کیا گھٹتا
میرا سایہ ہی گھٹ گیا ہوتا

میں جب سے دیدۂ نم ناک میں رکّھا گیا ہوں
عذابِ منتِ افلاک میں رکّھا گیا ہوں

دیارِ کُن میں جب تک تھا، سراپا روشنی تھا
مگر اب سانولی پوشاک میں رکّھا گیا ہوں

میں سارے آسمانوں کی حقیقت جانتا ہوں
اگرچہ خاک ہوں اور خاک میں رکّھا گیا ہوں

مری گردش مرے اندر کی دنیا میں چھپی ہے
ازل سے میں بدن کے چاک میں رکّھا گیا ہوں

یہ کیا ہر شب صلیبِ آگہی پر خون ہونا
میں کیسے عرصۂ ادراک میں رکّھا گیا ہوں

میں اپنی آنکھ سے ہوں اب تلک مستور نیّرؔ
سنا تھا جامۂ صد چاک میں رکّھا گیا ہوں

گر جائیں زمیں پر تو سنبھالے نہیں جاتے
بازار میں دُکھ درد اچھالے نہیں جاتے

جاتے نہیں صحراؤں کو ہم عشق گرفتہ
جب تک دلِ مجنوں کی دعا لے نہیں جاتے

اب مجھ سے اِن آنکھوں کی حفاظت نہیں ہوتی
اب مجھ سے ترے خواب سنبھالے نہیں جاتے

آنکھوں سے نکلتے ہو مگر دھیان میں رکھنا
تم ایسے کبھی دل سے نکالے نہیں جاتے

ایسا بھی نہیں، چھوڑ کے جاتے نہیں خوباں
جاتے ہیں مگر لوٹنے والے نہیں جاتے

جنگل کے یہ پودے ہیں انہیں چھوڑ دے نیّرؔ
غم آپ جواں ہوتے ہیں، پالے نہیں جاتے

بہت مہنگا پڑا بیدار ہونا
کہ ہوتا جائے ہے دشوار، ہونا

ہزاروں ٹھوکروں کی داستاں ہے
کہیں اِک راستہ ہموار ہونا

شریکِ غارتِ گلشن نہیں ہوں
مرے کام آگیا بے کار ہونا

بس اپنا دامنِ دل دیکھ لینا
اگر چاہو مرا غم خوار ہونا

مرا اس دشت میں کوئی نہیں ہے
ذرا تم سایۂ دیوار ہونا!

مجھے بھی آنکھ میں تھوڑی جگہ دو
کہ میں بھی چاہتا ہوں پار ہونا

ق

کہاں وہ دن کہ اُس روشن جبیں کا
رُخِ مہتاب میں دیدار ہونا

کہاں یہ دن وفورِ بے دلی سے
نظارے کا نظر پر بار ہونا

مجھے نیّرؔ اکیلا کر گیا ہے
اسیرِ قریۂ پندار ہونا

◎

تم اپنے سامنے دیوار ہونا
اگر چاہو کبھی مسمار ہونا

یہیں سے جادۂ اقرار نکلے
کبھی تم صاحبِ انکار ہونا

اگر سوچوں تو باہم منسلک ہے
مرا بے زر، ترا زردار ہونا

فرازِ دار کی جانب نظر کر
اسے کہتے ہیں ہم، معیار ہونا

بڑی مشکل سے میں مرہم ہوا ہوں
بہت آسان تھا تلوار ہونا

بہت اہلِ حرم کو کھل رہا ہے
مرا اِس پار سے اُس پار ہونا

گئے وہ دن کہ چشمِ اہل زر میں
شرارے دیکھنا، لاچار ہونا

ق

ابھی تک یاد ہے، عہدِ ستم میں
وہ دونوں سمت کا تیار ہونا

تمہارا درپئے آزار رہنا
ہمارا طالبِ آزار ہونا

انہیں موقع دیے جاتا ہے نیّرؔ
ہمارا آخری کردار ہونا

آنے والوں کو روکتا تھا میں
لوگ سمجھے، بلا رہا تھا میں

مجھ کو بہتر زبان کے چھالے
خامشی میں بھی جل رہا تھا میں

خود ہی ملتی گئی کڑی سے کڑی
اچھے لفظوں کا سلسلہ تھا میں

لوگ روتے تھے حالِ دل پہ مرے
اُس نے پوچھا تو ہنس دیا تھا میں

داستانِ رہائی اتنی ہے
دل کا رُکنا تھا اور رہا تھا میں

صرف آنکھیں پڑی تھیں رستے میں
جب وہ آیا تو جا چکا تھا میں

میری نیندوں سے لڑ پڑی دنیا
اُس کو خوابوں میں دیکھتا تھا میں

اب جو سوچوں تو خوف آتا ہے
کیسی رہ سے گزر گیا تھا میں

تو نے سمجھا تھا بے نوا ہوں میں
قتل ہو کر بھی گونجتا ہوں میں

اب بھی کہتے ہو راہ صاف نہیں
اب تو خود کو ہٹا چکا ہوں میں

بے خبر تھا میں اپنے ہونے سے
آپ آئے، پتہ چلا، ہوں میں

پہلے کہتے تو رک بھی سکتا تھا
اب تو جانے کو اُٹھ پڑا ہوں میں

جاگتا ہوں تو چپ سی لگتی ہے
خوب سوتے میں بولتا ہوں میں

کٹ گئے آپ کاٹنے والے
دیکھ اب بھی ہرا بھرا ہوں میں

اب پلٹ جا، تری محبت میں
تجھ سے آگے نکل گیا ہوں میں

اپنی اپنی زبان بند کرو
ذہن رکھتا ہوں، سوچتا ہوں میں

تیرے جانے کی بات سنتے ہی
اپنی جاں سے چلا گیا ہوں میں

تیری دنیا میں کون رہ پایا
اپنی پوشاک میں رہا ہوں میں

اب مجھے خاک میں تلاش کرو!
اپنی آنکھوں سے بہہ گیا ہوں میں

بس آج مرے دل میں ترا ڈر نہیں آیا
اور آج تری سمت سے پتھر نہیں آیا

دو چار سوالات ہیں پھر مجھ کو اجازت
میں سیر کی خاطر تو فلک پر نہیں آیا

اس بحرِ طلسمات کی دنیا ہی عجب ہے
یوں عشق میں ڈوبا ہوں کہ اوپر نہیں آیا

کیوں وہم کی صورت مجھے بھیجا ہے زمیں پر
میں آ بھی چکا ہوں، مرا پیکر نہیں آیا

اے وحشتِ ویرانۂ دل! تیرا بُرا ہو
اک بار جو نکلا وہ پلٹ کر نہیں آیا

اک وہ ہیں جو ہر لحظہ خداؤں میں گھرے ہیں
اک ہم کہ ہمیں اک بھی میسر نہیں آیا

میں کھلتی بہاروں سے گریزاں تو نہیں ہوں
لیکن وہ گلِ سرخ پہن کر نہیں آیا

میں آیا تو سب سنگ بدن بول پڑے ہو
کیا پہلے اِدھر کوئی سخن ور نہیں آیا

سخن کروں گا میں تجھ سے، یہ کائنات ہٹا
تُو میری بات کے رستے سے اپنی بات ہٹا

میں اُس کو دیکھ بھی سکتا تھا، چھو بھی سکتا تھا
جب ایک موڑ پہ میرا حجابِ ذات ہٹا

ہزار رنگ کے منظر دکھائی دیں گے تجھے
بس آفتاب کے رستے سے ایک رات ہٹا

تمام کھیل کا انجام جانتا ہوں میں
یہاں بساط تو رکھ دے، یہ جیت مات ہٹا

وہ لڑکھڑایا، جھکا اور گر کے ٹوٹ گیا
جونہی پہاڑ کے شانے سے میرا ہاتھ ہٹا

میں تیرہ غار کو روشن سمجھتا رہتا تھا
پھر ایک روز اچانک یہ سنگِ ذات ہٹا

بہت عجیب سفر ہے یہ زندگی کا سفر
کسی کی نفرتیں رکھ لے کچھ التفات ہٹا

چلا بھی آ کہ فقیروں کے دل کشادہ ہیں
سب احتیاط پرے رکھ، تکلفات ہٹا

وہ شہرِ حسن کا حاکم بھی آئے گا نیّرؔ
تو پہلے دل کی سڑک سے تجاوزات ہٹا

چھوڑ جانے کو مری راہ میں آتا کیوں ہے
آ ہی جاتا ہے تو پھر چھوڑ کے جاتا کیوں ہے

آسرا اجنبی دیوار بھی دے دیتی ہے
یار! شانے سے مرا ہاتھ ہٹاتا کیوں ہے!

روز ہاتھوں سے ترے گر کے فنا ہوتا ہوں
دشتِ ہستی سے مرا نقش اُٹھاتا کیوں ہے

کس سے پوچھوں کہ شبِ ماہ نہ آنے والا
چاندنی بھیج کے اُمّید جگاتا کیوں ہے

میں تو ویسے ہی تجھے مٹ کے ملا کرتا ہوں
دل کے شیشے سے مرا عکس مٹاتا کیوں ہے

رائگانی میں کئی بار خدا سے پوچھا
میں اگر کچھ نہیں بنتا تو بناتا کیوں ہے

اب تو اُس آخری انکار کو مدت گزری
اب بھی اُس حسنِ جفا کیش سے ناتا کیوں ہے

لے پھر اب خود ہی اُٹھا قضیۂ دین و دنیا
میری جب سنتا نہیں، بیچ میں لاتا کیوں ہے؟

تم سے بہلے گی کب، اُداسی ہے
آج دل میں عجب اُداسی ہے

آسماں، رنگ، سنگ، شعر، صدا
دل سے دیکھوں تو سب اُداسی ہے

مانگنا کیا ہے بے دلی کے بعد
اور کیا چاہوں جب اُداسی ہے

نیستی ہے کمال ہستی کا
انتہائے طرب اُداسی ہے

دل میں بس دو مکین رہ پائے
پہلے اُلفت تھی، اب اُداسی ہے

بے کلی کا سبب محبت ہے
خامشی کا سبب اُداسی ہے

تم فریبِ نشاط کیوں لائے
میرے دل کی طلب اُداسی ہے

کچھ مروت گھر آئے مہماں سے
دل کی دُنیا، ادب! اُداسی ہے

سب سے کہہ کہہ کے تھک گیا نیّرؔ
کچھ نہیں، بے سبب اُداسی ہے

ہاتھ رکھّو، یہیں اُداسی ہے
یہ مرا دل نہیں، اُداسی ہے

ابتدا میں تُو اتنا خوش مت ہو
مجھ میں آگے کہیں اُداسی ہے

تو بھی اتنا نہیں قریب مرے
جتنی دل کی قریں اُداسی ہے

دیکھ اُس حسنِ سوگوار طرف
دیکھ کتنی حسیں اُداسی ہے

اس پہ قصرِ خوشی نہ ٹھہرے گا
میرے دل کی زمیں اُداسی ہے

رنج و بہجت تو بعد کے ہیں گماں
میرا پہلا یقیں اُداسی ہے

آنکھ یا پھیلتا ہوا کاجل
شام یا سرمگیں اُداسی ہے

تم اُداسی کو دیکھ سکتے ہو
میں جہاں ہوں وہیں اُداسی ہے

بجھتے گئے، صدائیں لگاتے گئے چراغ
آنکھیں تو کھول نیند کے ماتے، گئے چراغ

ایک ایک کرکے رَن میں بجھاتی گئی ہوا
ایک ایک کرکے سامنے آتے گئے چراغ

ہم جس طرف سے شعلہ بد اماں گزر گئے
ظلمت کدوں میں حشر اُٹھاتے گئے چراغ

اک میں ہی روشنی کے نہایت قریب تھا
بجھتے ہوئے مجھی کو جلاتے گئے چراغ

شب نے تو ایک بار ہی پوچھا تھا ''کون ہے''
شعلے تمام رات بتاتے گئے ''چراغ''

میں جل پڑا تو لوگ پکارے کہ روشنی!
میں بجھ گیا تو اشک بجھاتے گئے چراغ

وہ اُس طرف اندھیرے بچھاتا چلا گیا
ہم اِس طرف خیال میں لاتے گئے چراغ

ظلمت کے دائرے میں سسکتی تھی روشنی
دل سے نکل کے رات میں جاتے گئے چراغ

کب تک میں اپنی آنکھ میں اُن کو سنبھالتا
رخصت کِیا تو اشک بہاتے گئے چراغ

نیّر فلک پہ ہوں پہ قبیلہ تو ایک ہے
سونے لگے تو مجھ کو جگاتے گئے چراغ

تُو گھر سے نکل آیا طلب گار سمجھ کر
ہم نے تو پکارا تھا تجھے یار سمجھ کر

ہم اُن کی خطاؤں پہ خداؤں سے لڑے ہیں
ایسے نہ ہمیں دیکھ خطاوار سمجھ کر

تو دل کے مسائل کے سمجھنے کو چلا ہے
اے یار، مرے یار، خبردار، سمجھ کر

میں نے بھی جنوں جھولیاں بھر بھر کے لٹایا
جب آئے مجھے لوگ سمجھ دار سمجھ کر

یوں ٹوٹ کے بکھرا کہ وہاں رو دیا میں بھی
آیا جو مجھے ریت کی دیوار سمجھ کر

اے یارو! مجھے گرد کی گردِش سے نکالو
اُترا تھا بگولے کو میں مینار سمجھ کر

دیکھا نہ گیا ہم سے تری نیند کا عالم
آئے تھے تجھے آپ سے بیدار سمجھ کر

میں حالِ دلِ زار سُناتا رہا نیّرؔ
وہ ہنستا رہا مجھ کو اداکار سمجھ کر

وہ تن کا تماشائی رہا، من نہیں دیکھا
دہلیز تک آیا بھی تو آنگن نہیں دیکھا

چہرے پہ کھلی دھوپ میں اس درجہ مگن تھا
آنکھوں سے برستا ہوا ساون نہیں دیکھا

اِس سمت سمیٹوں تو بکھرتا ہے اُدھر سے
دُکھ دیتے ہوئے یار نے دامن نہیں دیکھا

دروازے پہ آ کر جو کسی نے بھی صدا دی
دل کھول دیا، دوست کہ دُشمن، نہیں دیکھا

لفظوں میں چھپی درد کی خوشبو نہیں دیکھی
گُل دیکھنے والوں نے بھی گلشن نہیں دیکھا

گھر لُٹتے ہوئے دیکھ لیا جوں ہی کسی کا
پھر اُڑتے ہوئے اپنا نشیمن نہیں دیکھا

اک بار ہی آیا تھا وہ خس خانۂ دل میں
پھر میرے جہاں گرد نے یہ بَن نہیں دیکھا

کیوں میری تمنّا کی طرف دیکھ رہے ہو
کیا تم نے کبھی آگ پہ خِرمن نہیں دیکھا

اس نے بھی تبسّم کا ہنر دیکھ کے نیّر
آلام چھپانے کا مِرا فن نہیں دیکھا

نظمیں

آنے والوں کے رستے پہ آنکھیں رہیں
جانے والوں کو رخصت نہیں کر سکا

خود ٹوٹ کے بکھروں تو بکھر جاؤں بلا سے
میں درد کی دولت تو بکھرنے نہیں دیتا

شکست کس کی

عجیب منظر ہے!
دشتِ کرب و بلا میں
خیموں کی ایک بستی نے
کاخِ شاہی گرا دیا ہے
زمانہ دیکھے
کہ بے ردائی نے سچ کے نیزے سے
جھوٹ کا پردہ نوچ ڈالا ہے

پیاس کے بے کراں سمندر سے
صبر کی ایک موج آ کر
فرات سارا نگل گئی ہے
یہ کیسا منظر ہے!
مشک بردار بازوؤں سے
کسی نے تلوار کاٹ دی ہے
گلوئے اصغر نے نوکِ ناوک کو مات دی ہے
عجیب منظر ہے!
ایک شہ رگ نے
دھار خنجر کی کند کر دی ہے
ایک سر وہ جو اپنے تن سے جدا ہوا ہے
مرا نہیں ہے
مقابلے میں وہ کتنے سر تھے
جو زندہ بچنے پہ ناز کرتے تھے
اب شہیدوں کی زندگی سے
شکست کھا کر مرے پڑے ہیں!

مَری کے مال روڈ پر

یہ کس طرح کا سال ہے
چڑھی ہیں ایسی گرمیاں کہ زندگی وبال ہے
رگوں میں گرم خون ہے۔۔ کہ شعلہ بار جون ہے
نشیب میں اُبال ہے
پہاڑ پر سکون ہے!
یہ لوگ دھوپ کے داؤ سے
تپش کے اس حصار سے
نکل کے آئے اس طرح
کہ بے طرح ہجوم ہے

مری کے مال روڈ پر

دھنک کے سات رنگ میں ڈھلی ہیں خوش لباسیاں
نظر کی ڈور سے بندھی ہیں عارضی رفاقتیں
تفکرات سے پرے ہیں مست مست قہقہے
مسرتوں میں دب گئے ہیں رنج روزگار کے
وہ زر کی ریل پیل ہے
کہ دل لگی کے واسطے ہی بے طلب خرید ہے
وہ بزمِ عیش سج گئی
یہ لمحۂ نشاط ہے
اسی میں کائنات ہے
کہ بے خودی حیات ہے!

کسے خبر کہ گرد میں اَٹا ہوا
وہ مردوزن کے بے کراں ہجوم سے کٹا ہوا
وہ خوب رُو، نگاہ سے ہٹا ہوا
ڈرا ہوا، کم اعتماد، کم نصیب
نو برس میں عمر سے بڑا ہوا
۔۔۔وہیں پہ تھا

وہ سارا دن پھرا کیا

مری کے مال روڈ پر

نشاطِ دل سے بے خبر

یہاں وہاں جو کاغذوں کے پرزے محوِ رقص تھے

اُنہیں سمیٹتا رہا

اک اور دن گذر گیا

وہ کاغذوں کے ڈھیر پر

سمٹ کے اپنی گود میں

لپٹ کے اپنے آپ سے

فلک کو دیکھتا رہا

تھکن نے اُس کو پیار سے سلا دیا

ہوائیں اُس کے روز و شب بکھیرتی چلی گئیں

اُسے خبر نہیں ہوئی!

در نصیب توڑ دو

نئے سرے سے بانٹ ہو!

کانچ کا پھول

خوشبوؤں کے تعاقب میں چلتے ہوئے
تھام کر راس ایام کی
سینکڑوں دھاریاں ہم سفید و سیہ پار کرنے لگے
ہاتھ آ جائے قوسِ قزح
اور کومل سُروں کا مہکتا ہوا دامنِ ہفت رنگ
اُجلے لمحوں کی اُمّید کی اک کرن
ساعتوں کے گھنے جنگلوں کی
حسیں تتلیوں کے پروں سے
چُرائے ہوئے چند لمحے
جو جیون کے خاکے کو تصویر کر دیں

مسرّت کے جگنو پکڑ لیں
جو تیرہ شبی رشکِ تنویر کر دیں

سمے کے گھنے خارزاروں سے ہم کو ملا
پھول سا ایک پل
دو قدم ہی چلے تھے
اچانک وہ قسمت کی پوروں سے پھسلا
مقدّر زمیں پر گرا
ٹوٹ کر ایسے بکھرا
شب و روز میں کرچیاں بھر گیا
ہنستے روتے ہوئے
ہم یہ کہتے رہے
کانچ کا پھول تھا!

درسِ اوّل

محبت، مری جاں!

تذبذُب کی بے فیصلہ ساعتوں میں

اُچھالا گیا کوئی سکّہ نہیں

جس کے اک رُخ پہ "ہے" دوسرے پر "نہیں" ہو

یونہی خالی اوقات میں رنگ بھرنے کا

جیون کی پھیلی ہوئی ریت پر

چند شکلیں بنانے کا اک شغلِ بے کار کب ہے

محبت، وظیفہ ہے

ایسا فریضہ ہے جو کارِ دنیا بھُلا کر نبھانا ہے

یہ جنگلوں کی بھڑکتی ہوئی آگ کا کوئی شعلہ نہیں

مِن پہ رِکن مِن سی رِگرتی ہوئی
نرم کومل پھواروں کی رِم جھم میں
اندر تلک بھیگنا ہے!
سمندر کے سرگم پہ مدہوش وارفتگی ہے
جو میٹھے سُروں سے زمانوں کو مسحور کرتی رہی ہے
محبت مری جان!
جاں سے گزرنے کا رستہ ہے
منزل نہیں
ایک نقطے کی جانب سفر ہے
جہاں ''میں'' پگھلتا ہے
اور ''تو'' کے سانچے میں ڈھلتا ہے
آساں نہیں ہے
مری جاں، محبت!

مُونالیزا

اب آئی ہو
جبکہ بُجھ چکے ہیں
اُداس آنکھوں میں خواب سارے
وہ آرزوؤں کے پھول جتنے تھے
پتّی پتّی بکھر گئے ہیں
تمھاری یادوں کی دُھول بیٹھی
تو میرے دل کی اُداس بستی میں
غم نے ڈیرے لگا لیے
اور زرد زہراب موسموں میں
بہارِ اُمّید مر گئی ہے!

اب آئی ہو
جبکہ میں اکیلا ہی سہہ چکا ہوں

مہاجرت کے عذاب سارے
وہ تہمتوں کے حساب جتنے تھے
میں نے تنہا چکا دیے ہیں
میں بارشِ سنگ میں اکیلا
دکھوں سے گھائل بدن سنبھالے
تمھارے چہرے کی آرزو میں
ہجومِ خلقت کو دیکھتا تھا
اب آ گئی ہو تو اتنا سن لو
یہ مونالیزا سی مسکراہٹ
مری جوانی کے مردہ لمحوں کو زندہ کر دے
تو ٹھیر جانا
وگرنہ آنکھوں پہ بوسہ لے کر
تم اپنی دنیا کو لوٹ جانا!

لفظ خزانہ

''تم تو لفظوں سے بھرتے ہو آنچل مرا
قصرِ الفاظ جھٹ سے بناتے ہو
اور مجھ کو باتوں سے رانی بنا دیتے ہو
کیا مرے واسطے
دامنِ زندگی میں بس الفاظ ہیں؟''

مجھ کو تسلیم ڈالر کے اس دور میں
میرے دامن کا سرمایہ، الفاظ ہیں
جانِ جاں!
یہ مقدس خزانہ ہی مجھ کو
تری نذر کرنے کے لائق لگا

میرا ایمان ہے

حرمتِ لفظ کے اس کڑے کال میں

لفظ سے قیمتی چیز کوئی نہیں

لفظ اشعار ہیں

لفظ ہی گیت ہیں

لفظ سارے صحیفوں کا سنگیت ہیں

وِرد، پوجا، عبادت سبھی لفظ ہیں

اور دعا، کیرتن، حمد بھی لفظ ہیں

تین حرفوں سے بنتا ہے لفظِ خدا

ساری دنیا کی بنیاد بھی لفظ تھا

لفظ وعدہ بھی ہیں

لفظ اقرار بھی

لفظ رازِ محبت کا اظہار بھی

جانِ جاں!

میرے سب لفظ تیرے لیے!

اِک دریچہ کھُلا

ایک کھڑکی کھلی
حبسِ جاں سے نکلنے کا اک راستہ بن گیا
ذات کی تیرگی میں
چمکتی کرن ایک روزن سے گاتی ہوئی آ گئی
اِک دریچہ کھُلا
بھینی بھینی مہک اپنے دامن میں بھر کے ہوا آ گئی
ذات کے بند گنبد میں تازہ ہوا
زندگی پر یقیں پیدا کرنے لگی!
ایک در کھُل گیا

دُھوپ آنے لگی
میرے خوں میں اُداسی کی جو منجمد کرچیاں تھیں
پگھلنے لگیں!
نرم میٹھی حرارت کو پہنے ہوئے
تیرے ہونٹوں سے نکلے
مہکتے ہوئے لفظ گرنے لگے
تیری آواز میں لفظ اقرار کے
دشتِ دل میں بہاریں کھلانے لگے!

حبسِ جاں میں کوئی جیسے کھڑکی کُھلی
مثلِ بادِ صبا۔۔۔ایک خط آ گیا!

دَھرتی ماں

شاخ پر ڈولتے زرد پتّے کے مانند ہلنے لگی
اتنا سوچا نہیں
بے طرح لڑکھڑانے سے
اِس کے سہارے پہ آباد دُنیا بکھر جائے گی
کتنے بچّوں کے اُٹھتے قدم
دائمی برف میں گر کے جم جائیں گے
دھڑکنوں کا ترنم گھنی گڑگڑاہٹ میں دب جائے گا
دھرتی ماتا نے ہلتے سمے کچھ بھی سوچا نہیں!

حوصلہ، ضبط، برداشت
صدیوں سے ماں کی علامت میں تجسیم پاتے رہے ہیں

مری بھی تو ماں تھی

وہ اندر کے غم کا دباؤ بھی رکھتی تھی

لیکن کبھی اس کے سینے پہ ہم نے دراڑیں نہ دیکھیں!

تجھے کیسے۔۔۔کس دل سے اب ماں پکاریں

تو سوتیلی ماں بھی نہیں۔۔۔اے زمیں!

اس میں بھی لفظ ''ماں'' ہے۔

(۸/اکتوبر ۲۰۰۵)

منّ و سلویٰ

زمیں لڑکھڑائی
مکانوں کا ملبہ بنا
اور ملبے پہ بڑھتی ہوئی بھوک پھیلی
جو بچّے بچے تھے
وہ بھوکی نگاہوں سے افلاک تکتے ہوئے سو گئے تھے
گجردم سماوی پرندوں نے پیکٹ گرائے
عجب ذائقوں والے ''ویفرز'' حیرت سے کھاتے
بڑی چاکلیٹیں سُڑکتے ہوئے سوچتے تھے
غلط کہہ رہے ہیں جو کہتے ہیں
یہ اَن چکھے ذائقوں والی چیزیں زمینی ہیں
اِن کو یقیناً خدا نے اتارا ہے
گر اِس جہاں کی یہ ہوتیں تو پہلے بھی ملتیں!

(۸/۱ اکتوبر ۲۰۰۵)

ہجر کے اندھیرے میں جاگتی نظم

تم کو بھی خبر ہو گی
آنسوؤں کی جھیلوں کے سرمئی کناروں پر
نیند کے پرندوں کی ڈار آ نہیں سکتی!
ہجر کی مسافت میں پاؤں ٹوٹ جائیں تو
وصل کے دیاروں کو خواب بھی نہیں جاتے
دل میں نارسائی کا
شور گونجتا ہو تو جلتی بجھتی آنکھوں سے کون خواب دیکھے گا!

تم کو بھی خبر ہو گی
وصل کی تمنا جب

تیرگی میں سوئی ہے
آنکھ جاگ جاتی ہے!

خواب رنگ کچّے ہیں
آنکھ بہنے لگتی ہے، رنگ دُھلنے لگتے ہیں
خواب اور اُمّیدیں
ساتھ چھوڑ جائیں تو زندگی نہیں چلتی
تم کو بھی خبر ہو گی
ہم تمھیں بتائیں کیا!

سُرخ گلابوں کے مَوسم میں

بہت بے رنگ سے دن ہیں!
ترے گلنار گالوں کے گلابی پھول کھلتے ہیں
نہ تیرے پھول ہونٹوں سے
ملن کی شوخ باتوں کے سنہرے رنگ میں لپٹی
کوئی تتلی ہی اُڑتی ہے
نہ دن کے زرد کاغذ پر تری تصویر بنتی ہے
نہ شب کی کالی چادر پر تری آنکھیں چمکتی ہیں
نہ تیری مسکراہٹ کی کرن ملنے کو آتی ہے
رگوں کے سرد غاروں میں
اُداسی جمتی جاتی ہے!

ترے گلنار گالوں کے گلابی پھول کھلتے ہیں
نہ تیرے چہرے کے پل پل بدلتے رنگ ملتے ہیں
حریمِ ذات میں جاناں!
بہت بے رنگ سے دن ہیں!

مشینی ارتقا

ستارے بجھتے جاتے ہیں
رخِ مہتاب میلا ہے
اُفق پر گرد اُڑتی ہے
شفق کا رنگ کالا ہے
دھنک کے سرمئی گھونگٹ میں ساتوں رنگ مدّھم ہیں
فلک کے نیلگوں چہرے پہ اک مٹیالی چادر ہے
تپش خورشید میں ایسی

زمیں کی مانگ اُجڑی ہے
گلوں کے رنگ پھیکے ہیں
صبا کی چال بوجھل ہے
ہوا خوشبو سے خالی ہے
مشینی کالکوں نے اک ردائے تار ڈالی ہے
ہماری صبح کالی ہے، ہماری شام کالی ہے
کثافت روک لو، اس سے ہوا کی سانس رُکتی ہے!

فلک کی سمت دیکھوں تو مری آنکھیں سلگتی ہیں
زمیں کی گود میں لیٹوں۔۔۔
مگر رُخسار جلتے ہیں
مرے آگے دھند لکا ہے
ذرا تم دیکھنا ہم دم!
مشینی ارتقا ہم کو یہ کس منزل پہ لے آیا!

اولکھّی بابل مورے!

میرے بابل کی آنکھیں بدل کیوں گئیں!
میرے بھائی کو کیا ہو گیا ہے
وہ اپنی ہتھیلی پہ میرے لہو کا نشاں چاہتا ہے
یہ دو پل میں کیسے ہوا ہے
مری زندگی ان کی ناموس کی موت سمجھی گئی
ماں۔۔۔ کہاں ہے؟ بتا!
میں تو اپنے ہی آنگن میں ٹھہری رہی
میری بچپن کی ساتھی، ہوا
میرے کانوں میں سرگوشیاں کرکے

مجھ کو کہانی سناتی رہی
میں سنی ان سنی کر گئی
خوشبو، میری سہیلی
مجھے رات دن اِن فصیلوں کے باہر بلاتی رہی
میں گئی ہی نہیں
روشنی میری دہلیز پر بیٹھ کر
مجھ کو باہر کا رستہ دکھاتی رہی
میں نے دیکھا نہیں!

اِس دفعہ فصلِ گُل کا نیا رنگ تھا
میرے دل کے چمن میں وہ کلیاں کِھلیں
جن کی خوشبو مرے جسم میں بہہ پڑی
جانے کیا ہو گیا
آج خوشبو نے جونہی پکارا مجھے
میں نے دیوار کے پار ڈالی نظر
روشنی مجھ کو رستہ دکھاتی گئی
ہاتھ تھامے ہوا کا میں چلتی گئی
آج پہلی دفعہ سب سے ملنے گئی۔۔۔

اُس سے ملنے گئی۔۔۔

کوئی سنتا نہیں

میرے اپنوں کے کانوں میں
غیروں کے طعنوں کا ڈر جم گیا
اتنی مہلت مجھے دو کہ میں پوچھ لوں
روشنی اور خوشبو
ہوا اور میں
سب شریکِ خطا
صرف مجھ کو سزا؟
کوئی سنتا نہیں
اسلحہ اجنبی، ہاتھ اپنوں کے ہیں
ماں! کہاں ہے
مرے پاس آ۔۔۔ دیکھ لے
مرتی آنکھوں میں بابل کی تصویر ہے!

حوّا سے

ذرا سنو تو!
تم اپنے چوگرد کیسی دیوار چن رہی ہو!
ہزار صدیوں کے حبس میں سانس گن رہی ہو
تمہارے کانوں میں کیوں تمہاری ہی انگلیاں ہیں!
تم اپنی آنکھوں پہ اپنے ہاتھوں سے کیسا پردہ گرا رہی ہو
یہ خود کو کس سے چھپا رہی ہو؟
تمہی سے قائم ہیں سارے اثبات زندگی کے
تم اپنا انکار کر رہی ہو!
اور اپنے خود سے مکر رہی ہو!

اکیلے پن میں بڑی گھٹن ہے
نہ اپنے ہونٹوں پہ قفل ڈالو
کسی نے تم سے غلط کہا ہے

کہ گھر کا دروازہ ہی تمہاری سمجھ کی حد ہے
یہ در تو مدت سے زنگ آلود میخ سے بند ہو چکا ہے
سماج نے اس پر ایک زنجیر ڈال دی ہے
رواج، مذہب، انا کی کڑیاں جڑی ہوئی ہیں
اُٹھو! یہ زنجیر توڑ ڈالو
کہ در کی زنجیر اب تمہارے قدم کی زنجیر بن چکی ہے
رواج، مذہب، انا کے سنگی حصار ڈھا دو!
نہیں جو کُھلتا تو در گرا دو!

اک اپنے من میں دریچہ کھولو
خدا کی دنیا بڑی حسیں ہے
وہ تتلیوں کی قطار دیکھو
گلوں پہ رنگِ بہار دیکھو
پھر اپنے دل کی کتاب کھولو
ہوا سے رشتوں کا باب کھولو
اور اپنی قسمت کے رُخ سے کالا نقاب کھولو!

فاصلے نہیں مٹتے

خواب اور خواہش میں
نیند بھر کی دوری ہے
وصل اور جدائی میں
آنکھ بھر کا وقفہ ہے
ہجر کے اندھیروں کی
چاند بھر تمنا ہے

پھر بھی ایسا ہوتا ہے
فاصلے مٹانے میں
عمر بیت جاتی ہے
فاصلے نہیں مٹتے

جاتے سمے

سرِ طاقِ وفائے جاں
تمہارے عہدِ بے ایفا کے چند اوراق رکھے ہیں۔۔۔
فراموشی کی لہروں میں بہا دینا
مرے دل کی منڈیروں پر
تمہاری آس کے جو دیپ روشن ہیں
ہوائے نارسائی سے بجھا دینا!
مری بے نور آنکھوں میں
یہ خوابوں کے ستارے ہیں
انہیں آنکھوں کے گردوں سے گرا کر چور کر دینا
یہاں دل کے دریچے میں

تمہارے نام کے سندیس رکھے ہیں
انہیں پڑھنا نہیں، بس چاک کر دینا
لبوں پر منجمد لفظوں کو دیکھو تو
انہیں سننا نہیں
بس نوچ کر چپ کے سمندر میں ڈبو دینا
مرے یہ کام کر دینا
میں اپنے جسم سے جاتا ہوں
یوں کرنا
مرے کچھ دن تمہاری رات میں گُم تھے
ملیں تو پاس رکھ لینا
کہ میری زندگی کی شام آ پہنچی!

گولک

یہ گولک ٹوٹ جائے گی
بہت سنبھال رکھتی ہو
پرائی آنکھ کیا
اپنی نظر سے بھی چھپاتی ہو
بہت چپکے سے
یوں تشنہ جوانی کی ادھوری خواہشوں
خوابوں، امنگوں کے
پریدہ رنگ سکّے ڈال رکھتی ہو
تمہارے دل کو بھی اسکی خبر ہونے نہیں پاتی!
چھپاتی ہو، بچاتی ہو مگر

اُس دن کے سپنے آنکھ میں بھر لیتی ہو
جس دن یہ گولک ٹوٹ جائے گی
تمہاری اپنی مرضی سے!

پریشاں ساعتوں، کمزور لمحوں کے بچائے نقرئی سکّے
جنہیں اک دن بکھرنا ہے
انہیں چنتی رہو گی
پھر بھی پورے کر نہ پاؤ گی
نہ جانو گی کہ کتنے کم ہوئے
مانو تو گولک ٹوٹتے لمحے
مجھے بھی ساتھ کر لینا
یہ سکّے مل کے چُن لیں گے

ہچکولے کھاتے خواب

(بلوچستان کا ایک منظر)

رنگوں کی بارات چلی تھی
اودے، پیلے، لال، گلابی
چمکیلے بھڑکیلے
آگے پیچھے پیراہن تھے
سب سے آگے چھوٹے
مٹی کی ڈھلوان سجائیں
خاک اُڑاتی، ترچھی رہ پر
خاکی قدم دھریں!!
مٹی مٹی پس منظر میں

نیل گگن سے ایسے رنگ اُترتے تھے
ایک خطِ صد رنگ کے پیچھے
رنگوں کا ہر نیلا سپنا
میلا ہوتا جاتا تھا!

لال سنہری چادر سے وہ اونٹ سجا تھا
رنگ برنگی لڑیاں تھامے
اُون کے گولے جُھول رہے تھے
صدیوں کے ہچکولے سہتی
خوابوں کی اک گٹھڑی
جس میں سات رنگ کی لہریں۔۔۔
رنگوں کے بارات میں کھوئے
جُھلسی مٹی، تپتے پتھر
اک حیرت سے دیکھ رہے تھے
وقت سے پیچھے
اونٹ کے اوپر
خواب سفر بھی سست قدم تھا!

بے شک اِنسان جَلد باز ہے

قسمت کی تختی سے میں نے
اک پل آنکھ اُٹھا کر دیکھا
کچرے کے اک ڈھیر پہ بچّے
اَدھ کھائی روٹی پر لڑتے
اک دوجے سے
وہ ٹکڑے بھی چھین رہے تھے
جن کو میں نے
ازل سمے کے پہلے پل سے
اُن کے بخت میں لکھ رکھا تھا!!

مُحبّت اور دُکھ

محبت ڈھونڈنے والی
حقائق دیکھتی دنیا میں
سپنے دیکھنے والی حسیں لڑکی!
حقیقت تلخ ہوتی ہے
تجھے معلوم کیسے ہو
محبت وہ پرندہ ہے
جو اپنا آشیاں ہر بار کانٹوں پر بناتا ہے
محبت وہ گلی ہے جو کسی جانب نہیں کھلتی
محبت وہ بیاباں ہے جو راہی چاٹ لیتا ہے

محبت ایسی ظالم ہے
کہ جس کے دل میں رہتی ہے
اُسی کا خون پیتی ہے!

وفا آمیز آنکھوں سے
زمانے کے دلِ بے مہر میں
چاہت کی خوشیاں ڈھونڈنے والی حسیں لڑکی!
زمانے کو وفا کا درس دینے میں
بہت صدیاں گزرتی ہیں
انہی صدیوں کے قدموں میں
محبت درد بنتی ہے
محبت سکھ نہیں ہوتی
خدائے دردِ الفت نے
محبت اور دکھ
دونوں کو اک پانی میں گوندھا تھا!

جھیل کچُورا

وادیوں کی حسین گلیوں میں
بادلوں کی برات چلنے لگی
روشنی سُرخ اوڑھنی لے کر
ابر پاروں پہ رنگ ملنے لگی

چوٹیوں سے پھسل کے کچھ کرنیں
جھیل کی تہہ میں جھلملانے لگیں
ننھی منی شرارتی لہریں
اُن کو چھو چھو کے مسکرانے لگیں

تخت بچھنے لگے گلابوں کے
سبز اور مخملیں کناروں پر
سات رنگوں کی کھیلتی پریاں
آن اُتریں حسیں کناروں پر

ناچتے پھول رنگ بجروں پر
ناز سے ڈولتی حسینائیں
جھیل کے جھلملاتے درپن میں
عکسِ رُخ گھولتی حسینائیں

پھول چہروں کو چومنے کے لیے
مہکی مہکی ہوائیں آگے بڑھیں
دل زدوں کو سنبھالنے کے لیے
بہکی بہکی گھٹائیں آگے بڑھیں

چل کے اپنی جگہ سے کوہ و دمن
رقص کرنے کو جھیل میں اترے
پھول، غنچے، شفق، ہوا، امبر
پانی بھرنے کو جھیل میں اُترے

بادلوں کا نقاب سرکا کر
شوخ، چنچل ادا، دھنک اُتری
دھیرے دھیرے گلاب چہروں پر
مثلِ رنگِ حیا، دھنک اُتری

گر کے قوسِ قزح کے ہاتھوں سے
گھل گئے سات رنگ پانی میں
ایسے اتری ہے شام کی صہبا!
جیسے اُترے ترنگ پانی میں

شیشۂ شام رنگ پانی کو
حسن دیتا ہے شنگریلا کیا!
کس تکلف سے جھیل میں اُترا
سانس لیتا ہے شنگریلا کیا؟

سارے اشعار اِک غزل کے ہیں
جھیل، بادل، پہاڑ، پھول، گھٹا
رنگ اپنی جگہ اکائی ہیں
پھر بھی تصویر میں ہوئے یک جا

لفظ میزان پر دھرے جائیں

اوّلیں یاد کے کنارے سے
مہرباں خوشبوؤں کے لفظ چنے
روشنی، رنگ، تتلیاں، جگنو

ڈولتے ڈگمگاتے رستے پر
میرے پہلے قدم سے ساتھ چلے
حرف، تختی، قلم، دوات، کتاب

آپ ہی آپ رُت بدلتی ہے
آنکھ میں سات رنگ آ بیٹھے
چاندنی، ابر، پیڑ، پھول، ہوا

روشنی آنکھ سے نکلتی ہے
اپنے اپنے مقام پر چمکے
ہونٹ، رخسار، چشم، تل، مژگاں

آنکھ پر صرف خواب فرض ہوئے
اس پہ تعبیر غیر واجب تھی
وصل، وابستگی، وفا، وعدے

لفظ تاجر سماج کے برتن
رسم کے طاق پر سجائے ہوئے
عہد، اقرار، عزم، دل، الفت

خشک ندّی چڑھاؤ کرنے لگی
دو کنارے نمک بہاتے رہے
ابر، اندوہ، اشک، غم، دامن

درد کے راستے ہزاروں ہیں
کیا خبر کون رُخ پہ بہہ نکلے
بے کسی، بھوک، بخت، بیماری

آڑی ترچھی لکیریں لگنے سے
آنکھ کے زاویے بدلتے ہیں
عقل، تقسیم، ارتکاز، خدا

سوچ کے بت کدے پگھلتے ہیں
جب تسلسل سے آنچ دینے لگیں
فلسفہ، فکر، تجزیہ، تاریخ

کھینچنے کو زمیں کی کھینچ بہت
کس کے افلاک پر قدم جمتے
کھوج، تشکیک، مادیت، انکار

لفظ میزان پر دھرے جائیں
میں تو خود کو بھی بھول جاتا رہا
لفظ ہی مجھ کو یاد کرتے رہے
میں نہیں، لفظ جیتے مرتے رہے

لہجہ نہ بدلنا

تری گفتار کا موسم بدلتے ہی
مرے جیون کی راہوں میں
خزاں پتّے بچھاتی ہے
ہوائے زرد اُٹھ کر ڈولتی، نوحہ سناتی ہے
یہ تیرا لمسِ بے گانہ ہے
یا ٹھنڈی ہوا ہے
بول، کیا ہے

جو ٹھٹھرتے گال سہتے ہیں
گلوں سے پتیاں گرتی ہیں
ایسی سرد مہری ہے
کہ شب نم ہوتی جاتی ہے!

بہارِ یاد میں اک دم
ترے لفظوں کی آہٹ سے
گلِ امّید کھلتا ہے
پرانے رنگ میں ڈوبی تری آواز آتی ہے
مرا موسم بدلتا ہے!

تیرے بعد

اپنے ہاتھوں سے تمناؤں کو برباد کیا
دل کی تعمیر میں تخریب کو بنیاد کیا
خواہشِ وصل کو دہلیز سے باہر کر کے
خانۂ دل میں غمِ ہجر کو آباد کیا
رات دن یاد رکھا، یاد بھلانی ہے تری
بھول کر بھی نہ کئی روز تجھے یاد کیا
سخت مشکل تھا تری شکل بھلانا لیکن
کارِ دشوار کو آسان ترے بعد کیا

اپنی دانست میں ہر کام مکمل کر کے
چھپ کے بیٹھا تھا درِ ذات مقفل کر کے
میں تو سمجھا تھا یہاں عالمِ تنہائی ہے
پھر بھی سوچوں میں تری انجمن آرائی ہے
دل کی ویران حویلی میں ہوا کی صورت
کس سہولت سے تری یاد چلی آئی ہے

بابا!

ہوا اجنبی ہے!
زمانے سے جب بھی ملاقات کی
درمیاں تجھ کو پایا
نشیبوں فرازوں کی کٹھنائیاں
تجھ سے ہو کر مرے پاس آئیں تو آساں!
کڑی دھوپ میں ایک تُو ایسا بادل رہا ہے
جو سر اور سُورج میں حائل رہا ہے
ہوا اجنبی اور مری گفتگو ڈر میں بھیگی ہوئی!

یہ ترے پیڑ کی اونچی شاخیں

ترے ''کُن'' سے تخلیق پایا ہوا

آشیاں چھوڑتے ہی

کئی تند لہریں مجھے ڈھانپ لیں گی

نئے پر کے ڈر سے

ہوا کٹ نہ پائے گی

اَن دیکھی دنیاؤں میں

کیسے اپنا توازن رکھوں گا

یہ دنیا کا پھیلا خلا

ایک پل میں نگل جائے گا

جانتا ہوں

میں سرمائے کے دوڑتے کھیل میں

ہندسوں کے ہنر سے تہی

گر پڑوں گا کہیں

میرے ربّ زمیں!

اور کچھ دن مرے ساتھ رہ

اور کچھ دن پنہ دے مجھے!

گورستان

میں نے کفنا کے تیری یادیں سبھی
اپنے سینے میں دفن کر ڈالیں
اب تو ہر ایک آشنا میرا
اپنی ٹوٹی ہوئی محبت کی
لاش کاندھے پہ لے کے آتا ہے
یہ نگر پھیلتا ہی جاتا ہے

دِل سفر سے بندھا ہے

ہر گھڑی رنگ طلب کرتی ہوئی آنکھوں سے
آخری بار ترے حسن کے ریزے چُن لوں
میرے جاتے ہی تری اور مری آنکھوں کے
درمیاں آئیں گے
بچھ جائیں گے میل اور برس!
آخری بار ترے چہرے پہ آنکھیں رکھ لوں
جس کی دہشت سے دھڑک اُٹھتے تھے ایوانِ وجود
سر جھکائے وہ جدائی کی گھڑی آئی ہے!

منظرِ نان ونمک ڈھونڈ رہی آنکھوں سے
تیری پیمان بھری آنکھوں میں

دیکھتا ہوں تو حیا آتی ہے
اپنی سیماب نگاہی مجھے کھا جاتی ہے

کھینچ لے جانے شکم آئے تو کیا چارہ ہے
رزق کانٹے سے لگا چارا ہے
ایک بار اور کڑے کوس بلاتے ہیں مجھے
ایک بار اور کہیں اور مجھے جانا ہے
(بے نیازی نے مرا رزق بکھیرا ہے جہاں)
پھر نئے لوگ، نئے دل ہوں گے
کس کو معلوم ہے
اب کس کے رُخِ زیبا میں
تیری رنگین شباہت کی جھلک اترے گی
پیشِ دل، پیشِ نظر
کس کے رُخ و چشم کی خوبی ہو گی
لیکن اُس حُسن کی رُوداد میں تُو بھی ہو گی!

تیرے بعد

اپنے ہاتھوں سے تمناؤں کو برباد کیا
دل کی تعمیر میں تخریب کو بنیاد کیا

خواہشِ وصل کو دہلیز سے باہر کر کے
خانۂ دل میں غمِ ہجر کو آباد کیا

رات دن یاد رکھا، یاد بھلانی ہے تری
بھول کر بھی نہ کئی روز تجھے یاد کیا

سخت مشکل تھا تری شکل بھلانا لیکن
کارِ دشوار کو آسان ترے بعد کیا

اپنی دانست میں ہر کام مکمل کر کے
چھپ کے بیٹھا تھا درِ ذات مقفل کر کے

میں تو سمجھا تھا یہاں عالمِ تنہائی ہے
پھر بھی سوچوں میں تری انجمن آرائی ہے

دل کی ویران حویلی میں ہوا کی صورت
کس سہولت سے تری یاد چلی آئی ہے



جسے خود سے ہی نہیں فرصتیں، جسے دھیان اپنے جمال کا
اُسے کیا خبر مرے شوق کی، اُسے کیا پتہ مرے حال کا

مرے کوچہ گرد نے لوٹ کر مرے دل پہ اشک گرا دیا
اسے ایک پل نے مٹا دیا جو حساب تھا مہ و سال کا

تجھے شوقِ دید غروب ہے، مری آنکھ دیکھ بھری ہوئی
کہیں تیرے ہجر کی تیرگی، کہیں رنگ میرے ملال کا

شبِ انتظار وہ مہ لقا، جونہی میرے سامنے آ گیا
مجھے کوئی ہوش نہیں رہا، نہ جواب کا نہ سوال کا

کبھی حالِ ہجر کہا نہیں، وہ ملا تو لفظ مِلا نہیں
کہیں گفتگو ہی میں کھو گیا، جو معاملہ تھا وصال کا

ISBN: 978-969-573-070-6
9 789695 730706

جہانگیر بکس
لاہور • راولپنڈی • ملتان • فیصل آباد • حیدر آباد • کراچی